خیابان بہار، ۲۰۲۴ء

"لہورنگ فلسطین" میں تہذیبوں کا تصادم

ڈاکٹر شہلا داؤد، اسسٹنٹ پروفیسر (ایف جی ڈگری کالج برائے خواتین پشاور کینٹ)
ذکیہ بی بی، لیکچرر (بونیر یونیورسٹی بونیر)
محمد یٰسین (سبجیکٹ سپیشلسٹ، اردو) ایلیمنٹری اینڈ سکینڈری ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ خیبر پختون خوا)

ABSTRACT

In the fictional literature of Urdu, there are probably very few novels written on the subject of Palestine that are so comprehensive and full of historical references. In this novel, there is a beautiful interplay of present and the past which is running side by side. The history of Palestine comes together with the references of Quran and the Bible. The centuries old relations between Muslims and Christians and Jews are presented with great skill and artistry. On the one hand the market of savagery is in action while on the other hand protest against it is in action too and at the same time the relations of humanity and love are being maintained as if a real Palestine is with us.

Key words:. Palestine , History, Interrelations ,values ,Civilization, Colonial power.

یہ ناول ایک منفرد موضوع پہ ہے جس میں ایک طرف تو بنی اسرائیل کی ہزاروں سال پرانی تہذیب ہے جو اتار چڑھاؤ، مقامیت، زمانی و جغرافیائی اختصاص اور رسم و ثقافت کے بطن سے جنم لیت ہے اور دوسری طرف اس میں انسانی اقدار کی توسیع بھی ہے اور انفرادی زاویئے سے زندگی پر نظر بھی۔ ناول کا سلوب بہت فطری ہے اس میں روح عصر کی جھلکیاں جابجا بکھری ہوئی ہیں اسی طرح ناول کے واقعات بھی بکھرے بکھرے سے ہیں مگر ان میں وحدت تاثر موجود ہے ۔ سب سے بہترین چیز یہ ہے کہ ناول کا موضوع پامال نہیں ہے۔ دنیا کی تین بڑی اقوام کے اس زمانے کے ذہنی رجحانات اور تصورات بھی موجود ہیں اور ان کا سماجی شعور بھی، جس نے تاریخ کی گود میں پرورش پائی تھی اور جس نے حال میں تاریخ کا دھارا بدل دیا تھا۔ حالیہ مسائل کے ساتھ ساتھ قدیم مسائل بھی ہین اور ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھا گیا سلوک بھی اجتماعی لاشعور کے ذریعے در اندازی کر رہا ہے۔ گویا ناول میں کلچر سٹڈی کے عناصر بھی موجود ہیں

حالیہ زندگی کے ساتھ جب تاریخ کی دھڑکنیں بھی شامل ہو جاتی ہیں تو زندگی کے سارے رنگ نکھر کے سامنے آجاتے ہیں۔ متضاد تصورات و اقدار کے حامل کردار جو ایک ہی مرکز پہ آ کے جمع ہو گئے ہیں تو لگتا ہے کائنات کا مرکز یہی خطہ زمین ہے اور اس میں کسی حد تک سچائی بھی ہے۔ کیونکہ یہاں پہ مرکز صرف خطہ زمین نہیں بلکہ انسانیت ہے۔ یہاں فطرت اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ موجود ہے مگر اس مرکز پر موجود ہونے کے باوجود بکھر بکھر کر رہ جاتے ہیں۔ گویا ایک پتلی تماشہ ہے جس کی ڈوریں کوئی اور ہلا رہا ہے ۔

ناول کے کردار اپنی مرضی کے مالک نہیں بلکہ وہ عالمی استعمار کے اشاروں پہ ناچ رہے ہیں وہ اپنے ہونے کا ثبوت دینے کے لیے بے چین ہیں مگر ان کا وجود عدم کے چاک پہ رقصاں ہیں ان کی فتح و شکست کے فیصلے کہیں اور ہو رہے ہیں فیصلے وہ کرتے ہیں جن کے ہاتھوں میں طنابیں ہیں پتلیاں بس ناچ رہی ہیں۔

"پہلی جنگ عظیم نے پانسہ پلٹ دیا۔ انگریز قابض ہو گئے اور سیاسی کھیل نے تیزی پکڑ لی اور دونوں قومیں دہشت گرد جتھے بنانے میں الجھی ہوئی تھیں دوسری جنگ عظیم میں یہودیوں کی فلسطین کے شہروں پر جو یلغار ہو رہی تھی اس نے عربوں کو پریشان کر دیا تھا۔ ہنگاموں نے زور پکڑ لیا تھا اور انہی ہنگاموں میں وہ پیارا سا لڑکا بھینٹ چڑھا اس کی شہادت پر سارہ اور یوسف مہینوں ملول رہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی حالات کے غیر یقینی رخ "سب ٹھیک ہے" جیسے الفاظ سننے کے متمنی رہتے تھے"۔(۱)

ناول میں وقت اور تاریخ کا تجربہ ایک انفرادی صورت میں سامنے آیا ہے کرداروں کا وجودیاتی تجربہ ہے اور اس کے لامحدود امکانات ہیں وقت کی رفتار ہے۔ ناول کی ہیئت ایسی ہے کہ اس میں زمان و مکان، تاریخ اور سماج و زندگی کا تصور ایک ساتھ موجود ہیں ناول میں جو زمانہ نظر آ رہا ہے اس وقت کے سماجی شعور کو بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے معاشی اور ثقافتی زندگی کی جھلک ہے چونکہ ناول کا موضوع ایک وسیع و عریض تاریخ کے پس منظر میں اپنے اندر بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے اس کا پلاٹ تاریخ، سماج، قوموں کا اجتماعی لاشعور، کرداروں کی نفسیات ریاستوں کی تخلیق اور شہروں و تہذیبوں کا انہدام، نسلوں کا ارتقائی سفر تمام تر چیزیں اس وسعت میں سما گئی ہیں۔ اس ناول میں تاریخ کے وہ اوراق ہیں جو دفن ہو چکے ہیں مگر اپنے مدفن سے جھانک رہے ہیں اور لمحہ موجود میں جیتے جاگتے کرداروں کو اپنے ساتھ جوڑے ہوئے ہیں اگرچہ

ان کا حال کچھ مفاد پرستوں اور مفسدوں کے نشانے پر ہے مگر وہ ماضی کے سروں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور اپنے اندر بہت کچھ امکانات چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ تاریخ کا ایک طلسم ہوشربا ہے جس میں روحانی تجربات بھی ہیں یہاں ماضی ایک طرف خود پسندی کی صورت موجود ہے تو دوسری طرف یہی ماضی ایک قابل فخر سرمائے کی صورت بھی ہے تینوں اقوام اسی سرزمین کے ساتھ جڑی ہیں اور کسی بھی ایک کا زبردستی اخراج فرعون کی یاد دلاتی ہے۔

> "تھیوڈور ہنس پڑا۔ اس کا چہرہ جو چند لمحے پہلے بہت مدبر اور سنجیدہ سا محسوس ہوتا تھا اب قدرے شگفتہ نظر آنے لگا۔ "آفندی یہ فلسطین دلہن تو ہماری تھی پر یہ کسی اور کے ساتھ بیاہ دی گئی ہے اب اسے دوبارہ حاصل کرنا تو ہمارا مشن ہونا چاہیے نا" آفندی مزاح کی لطافت سے بھری اس مثال پر کھکھلا کر ہنسا اور بولا "خیال رکھیے یہ دلہن سے زیادہ دلنواز محبوبہ ہے اور بڑی ہرجائی محبوبہ ہے کتنے عاشق ہیں اس کے۔ کیسی کیسی خوفناک لڑائیاں اور جنگیں اس کے چاہنے والوں نے اس کے لیے لڑیں۔ یہ کہیں لٹی کہیں اجڑی پر چین اس کو بھی نہیں۔ اس کے نئے عاشقوں نے اسے پھر پھانس لیا بیاہ رچا لیا اس سے۔ اب اس سہاگن کے صدیوں پرانے عاشق پھر اسے حاصل کرنے کے لیے کمربستہ ہیں"۔(۲)

مگر مسئلہ ایک اور بھی ہے کہ عرب یہودی اس کو صرف عرب مسلمانوں، عرب یہودیوں اور عرب عیسائیوں کی دلہن سمجھتے ہیں وہ یورپی یہودیوں کو ہرگز نہیں دینا چاہتے۔ ایک ایسی ریاست جس کا وجود ہی متنازعہ ہے اور جو عالمی طاقتوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے اس سلسلے میں باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی اور یہودیوں نے یوگنڈا اور ارجنٹائن میں میں بھی اپنی ریاست کے قیام پر غور کیا مگر پھر یروشلم سے جذباتی وابستگی کی بنیاد پر اسی کو اپنی ریاست بنانے پر متفق ہو گئے ان دنوں چونکہ یہ سارا علاقہ عثمانی سلطنت کے پاس تھا اس لیے سلطان عبدالحمید زمینیں دینے پہ راضی نہ ہوا اور اس نے یہودی منصوبہ ساز ہرزل کے پیغام پر انکار کیا اور کہا۔

> "میں اسے (ہرزل) کو نصیحت کرتا ہوں کہ اس حوالے سے مزید کوئی بات نہ کرے میں اس زمین کا بالشت بھر حصہ بھی فروخت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ زمین میری نہیں بلکہ مسلمانوں نے اپنا خون دے کر یہ سلطنت قائم کیا اور وہی اسے چلا رہے ہیں"۔(۳)

جس کی پاداش میں ایک قوم کو اپنے نظام، اپنے شہر، اپنی ثقافت، اپنی جنم بھومی، اپنے لوگوں سے زبردستی جدا کیا جارہا ہے یہ تاریخ کا جبر ہے جو حال میں وقوع پذیر ہو رہا ہے کرداروں کے ذہنوں پر اس کے اثرات ناول کا اہم موضوع ہے فلسطین کے اصل باشندے بے دخل کیے جا رہے ہیں ان کو پیسے دے کر ان کی زمین لی رہی ہے یا ہتھیائی جا رہی ہے۔

> "اعلان بالفور کے ساتھ ہی دنیا کے مختلف ممالک سے یہودی ایک سیلاب کی شکل میں فلسطین کی طرف اُمڈ پڑے عربوں کی زمین دھڑا دھڑ بکنے لگی زمینوں کی کاشت اور نڈیوں سے آہستہ آہستہ عربوں کی بے دخلی شروع ہوئی"۔(۴)

ارض مقدس کے باشندے نفسیاتی طور پر اس کے زیر اثر کیسے شکست وریخت کے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں ہنستے بستے گاؤں روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑائے جا رہے ہیں اور اپنے پیچھے دھول اور مٹی کی صورت سوالوں کے طوفان اٹھائے جا رہے ہیں۔

> "یائل نے کہا" ساری یہودی قوم کو ان بچارے فلسطینیوں سے معافی مانگنی چاہیے جنہیں انہوں نے دیس نکالا دیا ہے اور ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگنی چاہیے جنہیں انہوں نے گولیوں سے بھون دیا۔ دیر ویاسین اب بھی میری یادداشتوں میں محفوظ ہے"۔(۵)

دوسری طرف ایک اور قوم جو برتری، فتح اور طاقت کے نشے میں سرشار ہے۔ جس کے اپنے کچھ ٹیبوز ہیں تحکم جس کی فطرت میں شامل ہو چکا ہے جو سماج میں استحصالی عنصر کے طور پر سامنے آتا ہے جس کی وجہ سے باقی دو قومیں بقا کے مسئلے سے دوچار ہو چکی ہیں کیونکہ درمیان میں عیسائی بھی ہیں چھوٹے سے خطے میں یکجا تینوں اقوام، جو ہزاروں سال سے ایک ساتھ ہیں چنانچہ تینوں کی تاریخ، تہذیب جڑی ہوئی بھی ہے اور متصادم بھی، اور یہی وہ نقطہ ہے جس پہ ناول کے کرداروں کا سنگم ہوتا ہے اسی کی وجہ سے لبرل ازم اور شدت پسندی کا اتصال ہوتا ہے۔ مگر ان دونوں انتہاؤں کے درمیان انہی قوموں سے تعلق رکھنے والے کچھ ایسے کردار بھی ہیں جن کے چہروں پر انسانیت کا سنہری خول ہے جس سے نرم سنہری کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور ارد گرد اجالا پھیل رہا ہے ناول نگار نے کرداروں کو جس حسن کاری اور دلآویزی سے بنا ہے کہ اس میں محبت کا سنہری دھاگہ استعمال کیا ہے ان میں نگارش کا ایک توازن ہے جو انتہاؤں پہ ڈانواڈول نہیں ہونے

دیتا۔ اور ان کرداروں کو درخشندہ اور تابناک بنا دیتا ہے کیونکہ ان کرداروں اور ناول کے واقعات میں کوئی سیاسی تعصب نظر نہیں آتا اور یہی توازن اس کا حسن ہے۔ کیونکہ آج کا ناول نگار یہ جانتا ہے کہ انسان ہی اس کائنات کی اصل اکائی ہے وہ بنیادی طور پر پہلے انسان ہے اس کے بعد وہ قوموں اور قبیلوں میں بٹتا ہے تو اچھا اور برا انسان کہیں بھی پایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یوسف سرمست کہتے ہیں۔

"نفسیاتی بصیرت کی وجہ سے یہ ناول نگار سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے آگہی کو اپنے ناولوں میں بڑے سلیقے سے برتتے ہیں۔ آج کے سنجیدہ ناول نگار بھی یہی خصوصیت رکھتے ہیں وہ صرف یہ نہیں بتاتے کہ ان پر کیا بیت رہی ہے بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان پر یہ بپتا کیوں پڑی اور ان کے اطراف کیا ہو رہا ہے"۔(۶)

ناول میں رومانویت اور جدید انسان کے مسائل ہیں چونکہ ناول کے سارے کردار ہی پڑھے لکھے اور حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھنے والے ہیں اس لیے وہ عالمی تناظر میں دیکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔۔۔ کا کردار کا اس کرب کا نمائندہ کردار ہے جو عام فلسطینی مسلمانوں کا نمائندہ ہے ان کی ساری زندگی توازن اور اعتدال میں رہتے ہوئے اپنے لوگوں کے مسائل میں کمی کرتے ہوئے گزری۔ ان کے خوابوں کی جست، مقاصد کے حصول، فکر کی کشادگی اور حوصلوں کی بلندی ان کے ذہنی الجھنوں میں اضافہ کرتی ہیں ان کی جذباتی زندگی اور عقائد آپس میں متصادم ہو رہے ہیں لیکن وہ انسانیت کے رشتے کو برقرار رکھے ہوئے ہیں یائل اور منصور کی محبت ایسی ہی ہے یائل یہودی ہے اور منصور مسلمان دونوں بچپن سے ساتھ ہیں اور محبت ہو جانا فطری ہے جو وقت کے ساتھ گہری ہوتی چلی گئی دونوں جانتے ہیں کہ یہ کشتی پار نہیں لگ سکتی کیونکہ منصور کے والدین فلسطین کے معزز کاندان سے تعلق رکھتے ہیں تو یائل بھی نمایاں یہودی خاندان کی بیٹی ہے دونون کی شادی کی صورت میں بلوہ ہو سکتا ہے جس کے بارے میں منصور کہتا ہے۔

"ایک بار میں نے سوچا میں امریکہ سیٹل ہو جاتا ہے مگر یائل میرا اندر بوٹیوں میں کٹنے لگا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تمہاری میر شادی ایک دھماکہ ہو گی۔ سو پچاس دو سو یا تین سو ممکن ہے اس سے بھی زیادہ فلسطینی جانوں کے نذرانے پر؟ کیا

ہم اسے ہضم کر سکیں گے ؟ نہیں کبھی نہیں ۔ اگر ہم باہر چلے جاتے ہیں تو میرا اور تمہارا فلسطین آنا بین ہو جائے گا۔ کیا میں اسے برداشت کر سکوں گا؟

نہیں محبت کی اتنی بڑی قیمت دے کر میں زندہ نہیں رہ سکوں گا فلسطین لہو کی طرح میری رگوں میں گردش کرتا ہے ۔06"

یہاں پہنچ کر ناول آئزک باشیو سنگر کے ناول "غلام" سے مشابہت اختیار کر لیتا ہے جس میں ایک یہودی غلام اور عیسائی آقا کی بیٹی کی محبت کی کہانی ہے اس غلام سے شادی کے بعد جب عیسائی لڑکی یہودیت قبول کر لیتی ہے اور اس کے ساتھ رہنے آ جاتی ہے اور بچے کی پیدائش میں مر جاتی ہے تو یہودی لگ اس کو یہودیوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیتے اور اسے بستی سے باہر "گدھے کی تدفین" کے ذلت آمیز ٹائٹل کے ساتھ دفن کر دیتے ہیں۔ یہاں پر یہودی ذہن کا احساس برتری اور گھمنڈی رویہ عروج پر نظر آتا ہے۔ جو اس ناول کے کچھ کرداروں اور مجموعی یہودی ذہنیت کا عکاس بھی ہے۔ جیسے کہ یائل کی پھوپھی کہتی ہے۔

> "کاروباری فراست ہماری قوم کو قدرت نے ودیعت کی ہے توڑ جوڑ اس کی گٹھی میں ہے غیر معمولی ذہانت فطانت یہودی قوم کے انعام ہیں۔ من و سلویٰ جیسا تحفہ بھی یہودی قوم کے لیے ہی آسمانوں سے اترا۔ اب قومیں جلتی ہیں تو بھئی جلو۔ سچ تو پھر یہی ہے کہ ہم ہیں ہی خدا کے لاڈلے"۔(۷)

اور یہی ذہنیت ان کو دوسری اقوام کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرنے پر اکساتی ہے۔ مگر جیسے کہ انسانی فطرت کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ نہ بالکل سفید ہے نہ ہی سیاہ ایسے ہی اس ناول کے کردار بھی ہیں ایک ظالم قوم سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی ان کے دماغ بہت روشن ہیں اور ذہن وسیع ہیں جس میں دوسری اقوام کے لیے گنجائش بھی ہے اور تاریخ کو وسیع الظرفی کے ساتھ دیکھنے کا حوصلہ بھی۔ جیسے کہ اپنی پھوپھی کے ساتھ ایک مکالمے میں یائل کہتی ہے

> "اگر سچی بات کہوں ڈھوڈا (عبرانی میں خالہ، پھپھی۔ ممانی چچی) تو سن لیجیے برا نہیں منانا۔ حقیقت یہ ہے کہ یروشلم نہ تو آپ کا ہے نہ ہی مسلمانوں کا۔ ہاں آپ اسے عیسائیون کا کہہ سکتی ہیں۔ یہودیت نے صحرائے سینا میں جنم لیا۔ اب کوہ صیہون کیسے معتبر ہو گیا؟ کوہ سینا کیوں نہیں جہاں کتاب ملی اور خدا سے کلام بھی یہیں ہوا۔ مسلمانوں

کا تو براہ راست تعلق حجاز سے ہے۔بس ایک یاد کا واسطہ ضرور ہے البتہ عیسائیت یہاں ضرور پیدا ہوئی"(۸)

مجموعی طور پر یہ معاشرہ اتنی بڑی تباہی کے بعد نفسیاتی سطح پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے دوسری طرف جنگ عظیم دوم کی تباہ کاریاں ہیں جس نے معاشی بدحالی اور اخلاقی قدروں کی پامالی نے سماجی سطح پر عدم تحفظ اور عدم اعتماد کی فضا پیدا کی اس سے عمومی طور مایوسی، مردہ دلی، سرد مہری اور غیر یقینی جیسی صورتحال بھی پیدا ہو رہی ہے ان کا اعتماد رجائیت سے اٹھ چکا ہے اجتماعی موت کا المناک احساس ابھر رہا ہے۔عالمی سیاست کس طرح عام لوگوں کی زندگیوں پر اثر ہوتی ہے اور ان کو جہنم کا نمونہ بنا دیتی ہے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے نگینہ جبین کہتی ہیں۔

"جہاں تک سیاستدانوں کی مختلف کرتب بازیاں، جھوٹ، فریب اور افترا پردازیاں ہیں مگر زرا پھیل کر دیکھا جائے تو اسی فینٹسی کا طلاق عالمی سیاست پر بھی کم و بیش ہوتا ہے۔جس کا منظر نامہ مغرب کے تمام استحصال شدہ ممالک ہو سکتے ہیں جہاں ایک بڑے گھیرے کے ساتھ زیریں لہروں میں سیاست اور استحصال کی ایسی ہی صورت موجود ہے"۔(۹)

حیرت انگیز طور پر ناول کے تمام مرکزی کردار اس مایوسی اور ناامیدی سے دور ہیں ان کی فطری توانائیاں اپنی جگہ پر موجود ہیں اگرچہ کبھی کبھی وہ اپنوں کی بربادی پر ملول نظر آتے ہیں ان کے باطن میں نت نئے سوالات ابھرتے ہیں ان کا تابناک ماضی المناک پر چھائیں بن کر ان کا پیچھا کرتا ہے ان کا حال بے ترتیب ہے مستقبل الجھاؤ میں گھرا اور غیر یقینی ہے نو آبادی دور سے نکلتے ہوئے چاروں طرف سے بڑے بڑے جال اور ان میں گرفتار خلقت سے بھرا ہوا ایک پورا خطہ جو غیر یقینی حالات کا شکار ہے۔اس کے ساتھ ہی ناول کی کہانی میں بھی ایک الجھاؤ نظر آرہا ہے تقریباً آدھا ناول پڑھنے کے بعد بھی یہ واضح نہیں ہو پاتا کہ ناول نگار کیا بتانا چاہ رہی ہے اسرائیل کی تاریخ یا پھر موجودہ صورتحال یا پھر اس کے قیام پہ کچھ بتانے کی کوشش۔کیونکہ جس بآثر خاندان کو مرکز و محور بنایا ہوا ہے وہ کوئی عام لوگ نہیں جو باقی لوگوں کی طرح حالات سے متاثر ہوں۔اس میں حال کے ساتھ ساتھ ماضی پس منظری موسیقی کی طرح سنائی دیتی ہے جو ناول کے کرداروں کو آگے بڑھانے میں مددگار نظر آتا ہے اگرچہ یہ ماضی بہت دھندلا سا ہے مگر مفصل ہے تاریخ سے آگاہی رکھنے

والا قاری الجھن محسوس نہیں کرتا۔ اس میں ہجرتوں کا دکھ بھی ہے اور اپنوں سے، اپنے جانے مانے منظروں سے جدائی کا دکھ بھی۔

ناول کے مختلف کردار جو مزاج کے لحاظ سے بھی الگ ہے اور کچھ تو ایسے بھی ہیں جنون نے دنیا کے مختلف خطوں میں پرورش پائی ہے اس لیے ثقافت کا فرق بھی واضح ہے مگر جب وہ حالات کے باعث ایک خطے میں آ کے جمع ہو گئے تو ان کی روح ایک ہو گئی یا شاید وہ ہمیشہ سے ایک ہی تھی۔ جیسے کہ فرمان فتح پوری کہتے ہیں۔

> "ہر ناول ایک ذہنی سفر کا آغاز ہوتا ہے اور فطرت انسانی سے نقاب اٹھانے کی ایک کوشش"۔(۱۰)

منظر نگاری بہترین ہے اور ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے قاری پچھلی صدی میں کے درمیانی حصے میں موجود فلسطین کے تاریخی شہروں میں گھوم رہا ہے گلیاں، دروازے، دیواریں قدامت کے حسین رنگوں سے سجی ہوئی ہیں یہاں واقعات میں ربط و تسلسل ہے فکری و نظریاتی لحاظ سے ناول میں تینوں بڑی اقوام کی نمائندگی واضح طور پر موجود ہے نظریے اور فن میں ایک توازن نظر آتا ہے تینوں کی تاریخی عظمت پوری طرح آشکار ہوتی ہے یہاں سلمیٰ اعوان اپنے کرداروں کی تاریخ اور پس منظر سے پوری طرح آگاہ دکھائی دیتی ہیں اسی کے بارے میں شاعر علی شاعر کہتے ہیں۔

> "ضروری ہے کہ مصور کے ذہن میں بنائی جانے والی تصویر کا ایک خاکہ موجود ہو اور اس نے ہر زاویئے سے اس خاکے پر ذہنی صلاحیت مرکوز کر رکھی ہو۔ پھر وہ اپنے برش کو ماہرانہ انداز میں حرکت دے گا تو اس کے ذہن پر نقش تصویر کا خاکہ کاغذ پر مجسم ہوتا رہے گا اور بہت جلد ایک خوبصورت اور خوش نما تصویر اس کاغذ پر پینٹ ہو جائے گی جو قابل دید بھی ہو گی اور جاذب نظر بھی"۔(۱۱)

لہٰذہ کہانی پر توجہ مرکوز نظر آتی ہے اگرچہ کرداروں کی زندگی کا ہر پہلو گرفت میں نہیں آ رہا مگر بنیادی کہانی پر توجہ مرکوز نظر آ رہی ہے۔ ناول نگار کے سامنے تاریخ کا ایک وسیع کینوس بکھرا پڑا ہے اور وہ جگہ جگہ سے تصویر کے مختلف رخ دکھاتی ہیں کیونکہ تصویر کے تقریباً سارے رنگ وقت کے دست برد سے محفوظ ہیں ان کی چمک دمک آج بھی قائم ہے جو آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہیں تاریخ کی دکھتی رگیں بھی ہیں اور تلخ و شیریں حقیقتیں بھی۔ مگر دیکھا جائے تو یہ حقائق بعض

او قات تکلیف دہ بھی بن جاتی ہیں جب اس سے نکلنے کی کوئی صورت نکل نہیں پاتی اسی کے بارے میں علی عباس حسینی کہتے ہیں۔

"بہت سے حقائق ایسے ہیں جن کا نہ یاد رکھنا ہی زیادہ اچھا ہے""۔(۱۲)

اگر دیکھا جائے تو اردو ناول میں تاریخی موضوعات پر ناول بہت کم لکھے گئے ہیں جو لکھے گئے ہیں وہ بھی تاریخ کے حوالے سے حقائق پر مبنی نہیں بلکہ تاریخ و تکیل کا عجیب و غریب ملغوبہ ہے کچھ بزرگوں نے مذہبی و تبلیغ کے نقطی نظر سے اگر چہ درجنوں ناول لکھ ڈالے مگر تاریخ کا اصل چہرہ نا دکھا سکے اسی میں فن کا چہرہ بھی مجروح ہو گیا۔یوں یہ ناول تاریخ سے زیادہ داستانوں کے قریب چلے گئے۔ کہ یہاں پر اچھی صفات سے صرف مسلمان متصف نظر آتے ہیں۔ تاریخ کے ان جھروکوں سے تینوں بڑی اقوام کے آپس میں میل جول اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہنے کی روایات کی تصویریں ہی جھلکتی ہیں اور یہی حقائق ہمیں اس ناول میں نظر آتے ہیں جو اس ناول کو ایک منفرد مقام پہ فائز کرتا ہے ان حقائق کے بارے میں انور خواجہ لکھتے ہیں۔

فلسطینی۔۔۔۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی۔۔لوگوں کو آپس میں مل کر رہنے میں کوئی مشکل نہیں تھی۔وہ اپنی اپنی روایات اور مفادات کے ساتھ خوش دلی سے رہتے آئے تھے ہمارے سارے شہر یروشلم، نیفی، جافہ، نیز رتھ میں تینوں مذاہب کی روایتوں کو عزیز رکھتے تھے۔یہاں تک کہ بہائی اقلیت کا بھی بہت شاندار مزار حیفہ مین تھا جس کے چاروں طرف بہت خوبصورت باغات تھے صیہونی گروہ کی آمد نے یہ ساری پر امن فضا برباد کر ڈالی"۔(۱۳)

مجموعی طور پر یہ ناول ایک ایسی حویلی ہے جس کے جھروکوں سے تاریخ جھانکتی ہے وہ تاریخ جو خون آلود ہے ،جو مقدس ہے،اور جو اپنے کرداروں کے خوشیوں، غموں ا، دکھوں، رنج و الم، آرام و سکون، جذبات و احساسات، چین، راحت، انتظار، تڑپ، انتشار، خوف، عشق و محبت، غصہ و نفرت اور سازشوں کو کھولتا ہے۔ یہاں بحث اس بات کی نہیں کہ یہ تاریخی ناول ہے اور ایک ایسا پلاٹ وجود میں آتا ہے جس ک شیرازہ بندی ماضی اور حال کے سنگم پر ہوئی ہے جس میں ماضی کے عمیق مشاہدے بھی ہیں اور حال کے گہرے رنگ بھی اور مستقبل کی بازیافت بھی۔

فلسطینی معاشرہ اپنی سوچ ،اپنے کھانوں ،اپنی عمارات،اپنی تاریخ ،اپنی فکر سمیت جلوہ گر ہے اس میں ایک زمانے کی تاریخ مرتب ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فرد کی ذاتی فکر اور تاثرات بھی ہیں تلخ وشیریں تجربات کا ایک آئینہ بھی۔ جیتے جاگتے کرداروں کی وجہ سے قاری کو تاریخی بعد کا احساس نہیں ہوتا۔ڈاکٹر سنبل نگار کہتی ہیں۔

"اردوناول کے نقطہ نظر سے موجودہ دور اس لحاظ سے خاص طور پر زرخیز ہے کہ تقسیم کے بعد نئی سرحدوں کی دونوں طرف کشت وخون کا جو بازار گرم ہوا اس نے فنکاروں کو ہلا کر رکھ دیا ان کی تخلیقات میں اس خونیں داستان نے جگہ پائی یہ دائرہ پھیلتا چلا گیا اور عہد حاضر کے مسائل ومصائب ناول پر حاوی ہوتے گئے۔انداز پیشکش بھی بدلا انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں،ذہنی کشمکش رفتہ رفتہ اردوناول میں زیادہ جگہ پائیں"۔(۱۴)

اس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ایک فرد نہیں بلکہ قوموں کی زندگی کے نشیب وفراز بیان ہوئے ہیں اس لیے قوم کی نبض پہ ہاتھ رکھا ہے قومی عروج وزوال کی داستان ہے قومی آزادی کا تصور جدید دور کے ساتھ وابستہ ہے عہد قدیم سے ہی معاشرے بنتے اور بگڑتے ہیں تاہم جدید دور میں قومی آزادی فرد کی آزادی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ لیکن جیسے کہ جنگ تہذیب کی دشمن ہوتی ہے ایسے ہی غلامی تو اور بھی بری چیز ہوتی ہے یہ اقدار کو درہم برہم کرتی ہے شاید اسی لیے بچپن سے ایسی قوموں کے بچون کو بھی اپنی غلامی کا حساس ہو جاتا ہے اور اسی لیے منصور ڈانس سکول میں ٹیچر کے اصرار کے باوجود اپنا مستقبل رقص میں نہیں بلکہ جراحت میں تلاش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا فلسطین بہت زخمی ہے اسے علاج کی ضرورت ہے یہاں اس کا درد واضح ہوتا ہے۔

انسان کے لاشعور میں چھپی ہوئی بربریت کو واضح کرتی ہے چناچہ بجاطور پر اس ناول میں آزادی کے تصورات کو واضح کیا گیا ہے اور یہ تصورات تاریخی حوالوں کے بغیر ناممکن ہیں چناچہ سلمیٰ اعوان نے بجاطور پر تاریخی حوالوں کا استعمال کیا کیونکہ ان کے بغیر فلسطین کی تاریخ نامکمل ہے ۔

سلمیٰ اعوان نے اس ناول میں جو کردار شامل کیے ہیں لگتا ہے یہ صرف خانہ پری کے لیے ہیں اصل میں وہ فلسطین کے دکھ کو تاریخ کے حوالوں کے ساتھ بتانا چاہتی ہیں۔اور وہ کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئی ہیں کہ فلسطین کے رگوں سے رستالہو دنیا کو ایک الگ زاویئے سے دکھانا مقصود تھا۔

حوالہ جات

۱. سلمٰی اعوان، لہور نگ فلسطین، ص نمبر ۵۰، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد۔2013

۲. ایضاً ُص نمبر14 ،15

۳. رئیس احمد مغل ڈاکٹر:فلسطین،فرعون سے شیرون تک مشمولہ ماہنامہ بیت المقدس؛ص نمبر ۲۰:جلد،۹: شمارہ۶،۵:اسلام آباد2002:

۴. افتخار شفیع:تحریک آزادی فلسطین اور اردو ادب:صفحہ نمبر۲۱:علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی:۲۰۰۹ء

۵. سلمٰی اعوان، لہور نگ فلسطین، ص نمبر ۱۲۲، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد2013۔

۶. یوسف سرمست پروفیسر: بیسویں صدی میں اردوناول:ص نمبر۵۳:بک ٹاک:لاہور:۲۰۱۹ء

۷. سلمٰی اعوان، لہور نگ فلسطین، ص نمبر ۱۴۴، دوست پبلی کیشنز، اسلام آبا۲۰۱۳د

۸. ایضاً ُ،ص نمبر121

۹. ایضاً ُ:ص نمبر121 ،122

۱۰. نگینہ جبین:اردو ناول کا سیاسی و سماجی مطالعہ ،۱۹۴۷ء اور اس کے بعد:ص نمبر ۳۶۷:کیشو پرا کشن پریس الہ آباد: ۲۰۰۲ء

۱۱. علی عباس حسینی:اردوناول کی تاریخ و تنقید:س نمبر ۳۸۰:ایجو کیشنل بک ہاؤس:علی گڑھ:۱۹۸۷ء

۱۲. فرمان فتح پوری ڈاکٹر:اردوناول کا ارتقا مشمولہ اردو نثر کا فنی ارتقا:ص ۱۰۴:الوقار پبلی کیشنز:لاہور:۲۰۱۸ء

۱۳. شاعر علی شاعر:جدید اردوناول:ص نمبر۳۵:عکس پبلی کیشنز:لاہور2019:

۱۴. علی عباس حسینی:اردوناول کی تاریخ و تنقید:ص نمبر ۳۸۰:ایجو کیشنل بک ہاؤس:علی گڑھ:۱۹۸۷ء

۱۵. انوار خواجہ:بریدہ بدن:ص۶۷:حسنین پبلی کیشنز:لاہور:۲۰۰۶ء

۱۶. سنبل نگار ڈاکٹر:اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ:ص نمبر۸۶:ادب محل پبلی کیشنز:پشاور:۲۰۲۱ء